© rasailojaraid.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

اس میں کوئی شک نہیں کہ مسلم قوم کو اپنے دین سے برگشتہ کرنے اور اس کی متاعِ ایمان کی قیمت گرانے میں حکمراں قوم کی معاشی پالیسی اور مسیحی اداروں کی جارحانہ کارروائیوں کو بھی کافی دخل حاصل رہا ہے۔ لیکن اسنے بحیثیت ایک ملت جو عظیم نقصان نظامِ تعلیم کی تبدیلی سے پہنچا ہے وہ سب سے زیادہ المناک اور افسوسناک ہے۔ اس سے اس قوم کے نوجوانوں کے فکر و نگاہ کے زاویے بدلے۔ سوچنے اور سمجھنے کے انداز میں تبدیلی پیدا ہوئی۔ معیارِ خیر و شر میں ایک نمایاں تغیر رونما ہوا۔ ایمان اور یقین کی جگہ ریب و تشکک نے لے لی۔ جو خوب تھا وہی بتدریج ناخوب ہو گیا اور ناخوب سراسر خوب بن گیا۔

دنیا کا ہر نظامِ تعلیم کسی خاص کلچر یا تہذیب کو پروان چڑھانے کے لیے معرضِ وجود میں آتا ہے اس لیے ہر زندہ قوم اپنے نظامِ تعلیم کو اس طریق سے مرتب کرتی ہے کہ اس سے اس کے نوجوانوں کی علمی و فکری ترقی ہو سکے اور جب بڑے ہو کر وہ ہنگامۂ حیات میں عملاً شریک ہوں تو اس بنیادی اور اساسی تخیل کی خدمت کریں جس پر ان کے قومی تشخص کا دار و مدار ہے۔ اسی وجہ سے جب کسی قوم کا شیرازہ منتشر کرنا مقصود ہوتا ہے تو اس کے نظامِ تعلیم کو تبدیل کر دیا جاتا ہے۔ اور یہ تبدیلی بالکل تھوڑے عرصے میں پوری کی پوری قوم کو بانجھ بنا کر رکھ دیتی ہے۔ یہ ایک ایسی بدیہی حقیقت ہے جس پر دنیا کی ساری تاریخ گواہ ہے اور جس کے نتائج آج خود ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ آخر کیا وجہ ہے کہ یہ قوم جس کی حرارتِ ایمانی سے کبھی پوری انسانیت سرگرمِ عمل تھی آج ایک

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

راکھ کا ڈھیر بن کر رہ گئی ہے، وہ جس کے سوز یقیں نے عقل اور علم کو چار چاند لگائے، تہذیب کے گیسو سنوارے، تمدن کو ترقی کے آخری زینے تک پہنچایا، وہ خود آج بے روح انسانوں کی بھیڑ نظر آتی ہے یہ سب اس نئے نظام تعلیم کی کرشمہ سازی ہے

اسے ہماری بدقسمتی کے علاوہ اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ بعض لوگ اپنی سادگی سے ابھی تک یہ سمجھے ہوئے ہیں کہ تعلیم کا ہر نظام مفید اور کار آمد ہی ہوتا ہے اور انگریز نے جو نظام تعلیم ہمارے اس ملک میں نافذ کیا ہے وہ چونکہ انگلستان میں مفید اور بہتر نتائج پیدا کر چکا ہے اس لیے یہ لامحالہ ہمارے لیے بھی تریاق کی حیثیت ہی رکھتا ہے اور ہماری ساری برائیوں کا واحد علاج ہے۔ اس لیے وہ بدلے ہوئے حالات کے پیش نظر جو نیا نظام تعلیم مرتب کرنے کے لیے بیٹھتے ہیں اُس میں بعض مضامین کی کمی وبیشی تو کر دیتے ہیں مگر اس نظام کے بنیادی نقشہ میں قطعاً کسی تبدیلی کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ اس کا انداز تقریب قریب وہی رہتا ہے جو اوّل روز سے انگریزی نظام تعلیم کا ہے

اگر ان حضرات کی تجاویز اور مشوروں پر غور کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ دراصل یہ لوگ ابھی تک اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ علم تو محض حقائق کی پردہ کشائی ہے اس لیے دنیا کی ہر قوم کو جو اپنے اندر زندہ رہنے کا داعیہ رکھتی ہے ان حقائق کے قبول کرنے میں کوئی چیز مانع نہ ہونی چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے چھوٹے بڑے "مصلحین" ہمیں برابر یہ مشورہ دیئے جا رہے ہیں کہ ہم آگے بڑھ کر مغربی علوم وفنون کو حاصل کریں اور اس طرح اُن فوائد سے متمتع ہوں جو یورپ کو تقریباً تین سو سال سے حاصل ہو رہے ہیں۔ اگر خدا کا کوئی بندہ اس قوم کو یہ کہتا ہوا سنائی دیتا ہے کہ تم ان علوم کو بے شک حاصل کرو مگر یہ دیکھ لو کہ اس میں بہت کچھ زہر کی آمیزش بھی ہے۔ تو "مصلحین" کا گروہ فوراً اس کے درپے آزار ہو جاتا ہے اور اسے کٹھ ملا، ترقی کا دشمن، رجعت پسند کہہ کر نظر انداز کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یہ لوگ علم و فضل کے بلند بانگ دعووں کے باوجود ابھی تک اس حقیقت کو سمجھنے سے قاصر ہیں کہ علم سے مراد صرف فطرت کے رازہائے سربستہ کی تلاش و جستجو نہیں بلکہ اس میں بہت سے دوسرے عناصر اور عوامل بھی شامل ہیں اور دنیا میں آج تک کوئی محقق ایسا نہیں گزرا جس نے محض حقائق جمع کرنے میں اپنی قوتیں صرف کی ہوں۔ انسان جب بھی حقیقت کی تلاش میں نکلتا ہے تو کبھی خالی الذہن ہو کر نہیں نکلتا بلکہ اپنے ساتھ فکر و نظر کا زادِ راہ لیکر آگے بڑھتا ہے۔ پھر وہ اس نظامِ تکوینی کے اندر اور اس کے پرے جب حقائق کا کھوج لگانے کی کوشش کرتا ہے تو وہ یونہی دیوانوں کی طرح ہر وادی میں بھٹکتا نہیں پھرتا بلکہ ایک منزل کو دیکھتے ہوئے اُس کی طرف نہایت سوچ سمجھ کر قدم اٹھاتا ہے اُن راستوں کا تعین کرتا ہے جو اُسے جلد از جلد اُس منزل تک لے جاسکیں اور اُن پگڈنڈیوں کو چھوڑ دیتا ہے جو اسے دوسری سمت میں لے جانے والی ہوں۔ حقائق کبھی بھی مقصود بالذات نہیں ہوتے بلکہ ان سے ہمیشہ انسانوں نے نشانِ راہ کا کام لیا ہے۔ اگر سائنس دان اور فلاسفہ اپنی جد و جہد کا محور صرف حقائق کا جمع کرنا ٹھہراتے تو یہ سارے علوم و فنون منتشر واقعات و حوادث کا طومار ہوتے۔ ان میں وہ نظم و ترتیب ناپید ہوتی جو ان میں اب نظر آتی ہے۔ علم محض حقائق کا جمع کرنا نہیں بلکہ انہیں ایک سلک میں اس طرح منسلک کرنا ہے کہ ان میں ایک معنوی ربط پیدا ہو۔ اور اُن سے ہم ایک خاص نتیجہ تک پہنچ سکیں۔ ذہنی اور فکری آوارگی اور تحقیق و جستجو میں یہی بنیادی فرق ہے۔ حقائق کو جو چیز باہم مربوط کرکے ایک علم کی حیثیت دیتی ہے وہ ترتیب و تدوین ہی ہے۔ چنانچہ دیکھیے کہ مختلف نظریات رکھنے والے انسانوں نے قریب قریب ایک قسم کے واقعات سے کس طرح مختلف نتائج مرتب کیے ہیں۔

تاریخ انسانی میں واقعات کی جو مختلف داستانیں بکھری پڑی ہیں انہیں دیکھ کر ایک انسان یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ قوموں کے عروج و زوال میں انسانی بنیادی اخلاق ایک فیصلہ کن قوت ہے۔ جب قومیں اپنے آپ کو ایک خاص قسم کے اخلاق سے متصف کر لیتی ہیں تو انہیں ترقی حاصل

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہوتی ہے اور جب ان میں بداخلاقی آجاتی ہے، جب اُن میں عیش و عشرت کا دَور دورہ ہوتا ہے تو وہ تنزل کی آغوش میں چلی جاتی ہیں۔ اس نقطۂ نظر سے یہ مفکر قوموں کے عروج و زوال کو اخلاقی ترقی اور انحطاط کی تاریخ قرار دیتا ہے

ایک دوسرا صاحبِ فکر انہیں واقعات کو اس طریق پر ترتیب دیتا ہے کہ تاریخ کا ارتقاء ذرائع پیداوار کی گردش نظر آتا ہے۔ وہ تاریخی حقائق سے یہ ثابت کرتا ہے کہ دنیا میں کوئی قدر معروضی اور ازلی و ابدی نہیں بلکہ یہ سب طریقِ پیدائش کی کرشمہ سازیاں ہیں۔ جب دولت پیدا کرنے کے طریقے تبدیل ہوتے ہیں تو پوری انسانی زندگی میں ایک انقلاب آتا ہے۔ ساری اقدارِ حیات بدل جاتی ہیں اور زندگی کے سارے شعبے ایک دوسرے سانچے میں ڈھلنے لگتے ہیں۔ ایک معاشی نظام، جو در حقیقت ایک خاص قسم کے طریقِ پیدائش کا ہی مظہر ہے، صرف ایک زمانہ تک تو انسانی ضروریات و حاجات کی کفالت کرتا ہے مگر کچھ عرصہ کے بعد اس نظام کے اندر سے اس کی مخالف قوتیں ظاہر ہوتی ہیں جو اس نظام کی تخریب و شکست کے درپے ہو جاتی ہیں۔ پھر ان دونوں کے مابین تنازع شروع ہو جاتا ہے۔ اس تنازع کے نتیجہ کے طور پر ایک نیا معاشی نظام وجود میں آتا ہے۔ لہٰذا تاریخ کے میدان میں جو لڑائیاں لڑی جاتی ہیں وہ اس دنیا میں ایک معاشی نظام اور اس کے مخالف نظام کے درمیان وقوع پذیر ہوتی ہیں۔ اخلاق و مذہب، علوم و فنون اور تمدن و معاشرت سب کے سب ابن الوقتوں کی طرح اپنے زمانے کے غالب معاشی نظام کے رنگ میں رنگے جاتے ہیں۔

اسی طرح ایک تیسرے صاحب اٹھتے ہیں اور اس بات کو ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ زندگی کے مادی کارخانے میں تخریب و تعمیر کا جو ہنگامہ برپا ہے۔ بگاڑ اور بناؤ کا جو فلم دکھایا جا رہا ہے، زوال و کمال کا جو کھیل کھیلا جا رہا ہے ان سب کے پیچھے روحِ مطلق اپنا کام کرتی ہے۔ عالمِ خارجی بذاتِ خود کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ اس کی اہمیت صرف اتنی ہے کہ وہ روحِ مطلق کے سفرِ ارتقا کے لیے نشانِ منزل کا کام دیتا ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ایک اور صاحب آتے ہیں اور تاریخی شواہد سے یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ تاریخی ارتقا تحدی (چیلنج) اور اس کے جواب میں انسان کے ردعمل کا نتیجہ ہے۔

اس مقام پر پہنچ کر انسان کے دل میں قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ تاریخ جب محض ماضی کے واقعات و حادثات کا مجموعہ ہے تو پھر فلسفۂ تاریخ کے ان نظریات میں اتنا اختلاف کیوں نظر آتا ہے؟ اس کی وجہ صاف ظاہر ہے کہ اگرچہ دنیا کے ہر مفکر نے اپنے دلپسند نظریہ کی تشکیل میں انہی واقعات و حوادث پر انحصار کیا ہے جو تاریخ انسانی کا مشترک سرمایہ ہیں مگر ہر ایک نے اس تاریخی مواد کو اپنی نظر سے دیکھا ہے، اپنے ذہن سے ترتیب دیا ہے، اور اس سے وہ نتائج اخذ کیے ہیں جو اس کے اپنے طرزِ فکر سے مناسبت رکھتے تھے۔ اختلاف ان میں جو کچھ ہے وہ حقائق کا نہیں بلکہ ترتیب و تعبیر اور استنتاج کا ہے۔

یہ معاملہ صرف معاشرتی علوم تک ہی محدود نہیں بلکہ ترتیب و تدوین کے ہمہ گیر اور دور رس نتائج ان علوم میں بھی نمایاں طور پر نظر آتے ہیں جن کا تعلق قوانینِ فطرت سے ہے اور جن میں اختلاف کی بظاہر بہت کم گنجائش معلوم ہوتی ہے۔ آپ علم طبیعیات کو ہی لیجیے اور دیکھیے کہ دو مختلف ذہن رکھنے والے افراد انہیں قوانین سے دو بالکل متضاد نتائج اخذ کرتے ہیں۔ ایک آدمی قدرت کے مختلف مظاہر میں جب ہم آہنگی دیکھتا ہے تو اس سے فوراً اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ اس کائنات کے پیچھے ایک مدبر کی تدبیر کام کر رہی ہے اور یہ کائنات ایک نقشے اور پلان کے مطابق تخلیق ہوئی ہے۔ اس میں جو کچھ موجود ہے وہ سب کسی علت کا نتیجہ ہے اور سب سے بڑی علت خود اللہ رب العالمین ہے۔ یہ سارا کارخانۂ قدرت اپنے اندر ایک گہرا مقصد رکھتا ہے اور اس لحاظ سے انسان اندھی اور بے مقصد قوتوں کے ہاتھ میں ایک بے بس کھلونا نہیں بلکہ ایک صاحبِ مشیت و ارادہ ہستی ہے جو ان قوتوں سے جس طرح چاہے کام لے سکتی ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ایک دوسرا مفکر انہی مظاہرِ قدرت سے یہ نتیجہ برآمد کرتا ہے کہ ہماری اس کائنات میں جو ربط دکھائی دیتا ہے وہ فطرت کے قانونِ یکسانیت (LAW OF UNIFORMITY) کی کرشمہ سازی ہے۔ مادہ ہی کے اندرونی قوانین نے اس کائنات کے مختلف اجزا کے درمیان ایک ہم آہنگی پیدا کی ہے۔ اس عالم کے وجود کے لیے کسی بلند و بالا ہستی یا ذات باری کی کارفرمائی کا یقین ضروری نہیں کیونکہ یہاں علت اولیٰ خود مادہ ہی ہے۔ اس کے سوا انسان کو کچھ معلوم نہیں، نہ معلوم ہو سکتا ہے۔ یہ عالمِ رنگ و بو کسی خدائی منصوبہ یا کسی بالاتر ذہن و شعور کی مصلحتوں کا نتیجہ نہیں اور نہ کوئی قوتِ حیات ہی ایسی موجود ہے جو اس مادہ پر کسی قسم کا اثر ڈال سکے۔ پھر انسان خود اس کائنات میں ایک عارضی اور اتفاقی شے ہے جسے فطرت کی اندھی بہری قوتوں نے خلق کیا ہے۔ وہ بے شک اپنے آپ کو کائنات کا مرکز تصور کرتا ہے مگر یہ محض اُس کی ابلہ فریبی ہے۔

غور کیجیے، کائنات کے موجود حقائق وہی ہیں، اس کے اندر کام کرنے والے قوانین بھی یکساں ہیں، مگر اس کے باوجود انہی کے مشاہدے سے یہ دو متضاد نتائج آخر کس طرح اخذ کیے جا رہے ہیں۔ وجہ صاف ظاہر ہے کہ ان کی ترتیب چونکہ دو مختلف فکری بنیادوں پر کی گئی ہے اس لیے اُن کے نتائج بھی ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔

ہماری ان گزارشات سے یہ حقیقت منکشف ہو گئی ہو گی کہ علوم و فنون کے اندر اصل اہمیت حقائق کی نہیں بلکہ اُس بنیادی نقطۂ نظر کی ہے جس کے مطابق انہیں مرتب کیا جاتا ہے۔ بدقسمتی سے ہم کو انگریزی نظامِ تعلیم نے مغربی علوم سے صرف حقائق ہی نہیں دیئے بلکہ وہ بنیادی نقطۂ نظر بھی دے دیا جس کے تحت وہ مرتب کیے گئے تھے۔ اب دیکھ لیجیے کہ پچھلے ڈیڑھ سو برس میں ہم نے ان مغربی علوم و فنون کے حاصل کرنے میں جو قوتیں اور صلاحیتیں صرف کی ہیں اُن سے ہم کو بحیثیت مجموعی کیا فائدہ پہنچا ہے۔ پوری قوم ان علوم کو پڑھنے کے بعد ایک شدید قسم کے ذہنی انتشار میں مبتلا ہو گئی۔ ہمارے نوجوان ایک طرف تو ان تصورات کو بالکلیہ ترک کر دینے کے لیے تیار نہیں ہوتے جو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

انہیں ماضی سے ایک مقدس ورثہ کے طور پر ملے ہیں اور دوسری طرف ہمارے مدارس اور کالجوں سے وہ ایسے افکار سے متاثر ہوتے رہتے ہیں جو ان تصورات کی بالکل ضد ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ علوم و فنون بجائے انہیں کسی قسم کا فائدہ پہنچانے کے انہیں ایک سخت قسم کی ذہنی کشمکش میں گرفتار کر دیتے ہیں۔ ہمارے نزدیک یہی چیز موجودہ نظامِ تعلیم میں سب سے زیادہ ضرر رساں ہے۔ ہم اپنے ہاں جو ایک ذہنی خلفشار اور افلاس دیکھتے ہیں وہ اسی مغربی نظامِ تعلیم کا نتیجہ ہے۔ اس نے ہماری قوم کو فکری طور پر بالکل مفلس بنا کر رکھ دیا ہے۔ چونکہ میرا تعلق برسوں سے اس نظامِ تعلیم کے ساتھ چلا آرہا ہے اس لیے میں اس کے مہلک اثرات سے بھی پوری طرح واقف ہوں۔ میں نے طلبا کے مختلف طبقات میں گھوم پھر کر اس کے نتائج سے واقفیت حاصل کرنے کی کوشش کی ہے۔ آج تک جتنے طلبا سے میرا سابقہ پڑا ہے انہیں مندرجۂ ذیل تین طبقوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

ایک بہت بڑی تعداد ان طلبا کی دیکھنے میں آئی ہے جو اس زندگی اور اس کے مسائل کے متعلق کسی سنجیدہ غور و فکر کے قطعاً عادی ہی نہیں رہے ہیں۔ ان کی حیثیت بالکل جانوروں کی سی ہے جن کے سامنے بجز "چارے" کے کوئی دوسرا مقصد نہیں ہوتا۔ چونکہ یہ لوگ سوچ بچار کی زحمت ہی گوارا نہیں کرتے اس لیے ان کے ذہن ہر قسم کی کشمکش سے محفوظ رہتے ہیں۔ مغربی نظامِ تعلیم نے اس طبقے کو پوری طرح بیکار بنا دیا ہے اور ان سے سوائے اپنے پیٹ کے کسی دوسری خدمت کی توقع رکھنا بالکل عبث اور بیکار ہے۔

دوسرا طبقہ ایسا ہے جو مغربی علوم و فنون پڑھتا تو ہے لیکن ان کے بارے میں سوچتا بہت کم ہے مگر جونہی ان علوم کے اثرات اُس کے ذہن پر مرتب ہونے شروع ہوتے ہیں تو وہ خواہ اس کا زبان سے اقرار کرے یا نہ کرے۔ اس کا یقین بہرحال متزلزل ہوتا جاتا ہے اور وہ زندگی کے معاملات سے بالکل "شریفانہ" طور پر بے تعلق ہو جانے ہی میں اپنی عافیت سمجھتا ہے۔

تیسرا طبقہ وہ ہے جسے اسلام کے بنیادی نظریات و تصورات سے گہری عقیدت و وابستگی ہوتی ہے۔ وہ مغربی افکار کو باطل سمجھتا تو ہے مگر اس کے معاملہ میں مصیبت یہ پیش آتی ہے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کرنے تو وہ نہ حق کو حق اور نہ باطل کو باطل ثابت کر سکتا ہے اور نہ اسلام کے متعلق کوئی مثبت علم رکھتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ مغربی علوم سے بہت حد تک مرعوب ہو جاتا ہے اور اسلام کے اساسی تصورات کو ان کے مطابق ڈھال کر اُس تضاد کو دُور کرنے کی کوشش کرتا ہے جو اُس کے اپنے دلپسند نظریات اور مغربی افکار کے درمیان پایا جاتا ہے۔ مگر جب کسی نقطہ پر ان دونوں کے درمیان تطبیق کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تو وہ اسلامی تصورات کو "ملّا" کی اختراع کہہ کر بڑی بے باکی سے رد کر دیتا ہے۔

میں نے دین کے لیے قابلِ رشک حمیت رکھنے والے طلبا میں بھی اس ذہنی انتشار کی جھلکیاں دیکھی ہیں اور محسوس کیا ہے کہ یہ لوگ اسلام سے محبت رکھنے کے باوجود اُس سوزِ یقین سے خالی ہیں جو ایک مسلمان کا طرۂ امتیاز ہے اور جس کے بغیر عمل کی تڑپ پیدا نہیں ہو سکتی۔ ان بیچاروں کی ساری قوتیں اسی ذہنی کشمکش کی نذر ہو جاتی ہیں، اور وہ دینِ حق کے لیے بڑی مقدس آرزوئیں اور تمنائیں رکھنے کے باوجود اس کی کوئی خدمت نہیں کر پاتے۔

عمر کے اس دور میں جب ذہن ناپختہ ہو، جب فکری صلاحیتیں پوری طرح پروان نہ چڑھ چکی ہوں، جب انسان کا دماغ باہر کے اثرات قبول کرنے کے لیے بالکل تیار رہتا ہو، اس وقت اگر زندگی کے واقعات و حوادث یا مظاہرِ کائنات کے متعلق کوئی نقطۂ نظر ایک شخص کے دل و دماغ میں بٹھا دیا جائے تو پھر اُسے تبدیل نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے اثرات عمر بھر قائم رہتے ہیں۔ پھر اُس شخص کی ساری زندگی اپنے اسی نظریے کی توجیہ و تعبیر میں گزرتی ہے۔ وہ ہر آن اسی کوشش میں مصروف رہتا ہے کہ اسلامی تعلیمات کی کوئی ایسی تعبیر ہو سکے جس سے اُس کا بنیادی تصور میل کھاتا ہو۔

مثال کے طور پر آپ دیکھیے کہ مغربی نظامِ تعلیم میں ہم جو مضامین بچوں کو پڑھاتے ہیں اُن سے بحیثیتِ مجموعی اُن کے دماغ پر یہ اثر مرتب ہوتا ہے کہ یہ کائنات اور اس کی ہر شے تبدیل ہوتی رہتی ہے۔ اس کے اندر کوئی چیز بھی ایسی نہیں جسے سکون اور قرار نصیب ہو۔ اس نظریہ میں ایک جزو بلاشبہ صداقت کا بھی ہے لیکن اس سے ہمارے نوجوان کو جس نتیجہ تک پہنچایا جاتا ہے وہ یہ ہے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کہ زندگی کے خارجی مظاہر بدل جانے سے اخلاقی اقدار بھی تبدیل ہو جاتی ہیں اس لیے اس زندگی میں کسی ابدی قدر یا کسی حتمی اصول کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اب وہ نوجوان جو ذرا جری اور بیباک ہوتے ہیں وہ صاف طور پر کہہ دیتے ہیں کہ اسلام ایک وقتی تحریک تھی جس نے اپنے زمانے میں انسانیت کی بہت بڑی خدمت کی لیکن اب ان بدلے ہوئے حالات میں اس کی قطعاً کوئی افادیت باقی نہیں رہی۔ اس کے مقابلے میں وہ لوگ جو اسلام کو چھوڑنا نہیں چاہتے وہ خود اُ قرآن مجید میں سے اس نظریہ کی تائید میں کوئی عبارت تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور عام طور پر سورۃ الرحمٰن کی یہ آیت كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ ہی استعمال ہوتی ہے۔ پھر نئے افکار و نظریات کے قبول کرنے میں اگر کوئی چیز مانع نظر آتی ہے تو اسے دُور کرنے کے لیے یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ اسلام میں اجتہاد کا دروازہ تو قیامت تک کھلا ہوا ہے اس لیے ہمیں اپنے حالات کے مطابق ان مسائل کے بارے میں سوچنا چاہیے۔ انہی میں سے ایک گروہ ایک قدم اور بڑھا کر یہ دعویٰ کرتا ہے کہ مرکزِ ملت کو اس امر کا اختیار حاصل ہے کہ وہ وقت کے تقاضوں کے پیشِ نظر دین میں جو تبدیلیاں چاہے کرے اور یہی اسلام ہے۔

باقی رہی وہ نہایت قلیل سی تعداد جس کی طبیعت اس قسم کی توجیہات پر مائل نہیں ہوتی اس کا حال بھی اس طبقہ سے کچھ زیادہ مختلف نظر نہیں آتا۔ وہ اپنے ایمان کی عافیت اسی میں سمجھتی ہے کہ دنیا اور اس کے مسائل سے بالکل آنکھیں بند کرلے اور زندگی کے دن اس طریق سے گزارے گویا کہ یہاں کوئی ایسا مسئلہ ہی نہیں جو اس کی توجہ کا محتاج ہو۔ اس طبقہ کی آخری پناہ گاہ تصوف ہے اور متصوفانہ خیالات کے اتھاہ سمندر میں ہی ایک مدت گم رہ کر اس طبقہ کے لوگ اپنے خالق اور مالک سے جا ملتے ہیں۔ اس کارگہِ حیات میں یہ حضرات کبھی شریک نہیں ہوتے اور یہاں بالکل غیر متعلق تماشائیوں کی سی زندگی بسر کرتے ہیں۔ وہ اپنی ذات میں خواہ کتنے نیک اور پاکباز ہوں مگر انسانیت ان سے قطعاً کوئی فائدہ نہیں اُٹھا سکتی۔ جبر و استبداد یہاں کھلے بندوں پھیرتا ہے مگر انہیں اس کے روکنے کی کبھی فکر لاحق نہیں ہوتی۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یہ ہیں وہ عملی نتائج جو مغرب کے صرف ایک نظریہ کو قبول کر لینے سے ایک مسلمان نوجوان کے ذہن پر مرتب ہوتے ہیں۔ اور جب پوری قوم کو اسی قسم کے باطل نظریات پر پالا جائے تو اس قوم کی حالتِ زار کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اس مغربی نظامِ تعلیم نے ہمارے ذہنوں کے اندر جو انتشار اور خلفشار پیدا کر رکھا ہے اُس نے ہمیں کسی کام کا نہیں چھوڑا اور یہی دراصل وہ عظیم نقصان ہے جو ہمیں اس نظامِ تعلیم سے پہنچا ہے۔

اب اگر ہم اصلاحِ حال کرنا چاہتے ہیں تو اس کی صورت یہ نہیں کہ ہم چند مضامین میں تغیر و تبدل کر دیں یا مغربی علوم و فنون کے ساتھ اسلامیات کے اجزا بڑھا دیں۔ بلکہ اس کی صحیح صورت یہ ہے کہ مغرب نے جن حقائق کو اپنے باطل نظریات کے مطابق مرتب کیا ہے انہیں ہم اس کے نظامِ فکر سے الگ کر کے اسلامی نقطۂ نظر کے مطابق پھر سے مرتب کریں۔ یہ کام مشکل تو ہے مگر محال نہیں۔ آخر ہمارے اسلاف نے بھی تو کائنات کے انہی مظاہر اور حوادث کو ترتیب دیکر اپنے علوم و فنون اس طرح مدوّن کیے تھے کہ وہ اسلام کی بنیادی حقیقتوں سے ہم آہنگ ہو گئے تھے۔ انہی حقائق کے مطالعہ سے اُن کے اندر وہ عزم اور یقین پیدا ہوتا تھا جسے دیکھ کر پہاڑ بھی ندامت سے جھک جاتے۔ جب تک ہم یہ کام نہیں کرتے مسلمانوں کے اندر ایمان کی حرارت اور عمل کی تڑپ کبھی پیدا نہیں ہو سکتی۔

ہماری ان گزارشات کو دیکھ کر ممکن ہے کوئی صاحبِ فکر یہ کہیں کہ جب اس مغربی نظامِ تعلیم سے ہندوستان کی دوسری اقوام خصوصاً ہندوؤں نے بے پناہ فائدہ اٹھایا ہے تو مسلمانوں کو اس سے کیونکر نقصان پہنچ سکتا ہے۔ اس اعتراض میں جو منطقی مغالطہ موجود ہے اُسے ہر وہ شخص بآسانی محسوس کرتا ہے جو ہندو مت اور اسلام کے مزاج سے کچھ بھی واقفیت رکھتا ہو۔ اسلام ایک ہمہ گیر نظامِ حیات ہے جو زندگی کے سارے گوشوں پر پوری طرح حاوی ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس وجہ سے جب کسی مسلمان پر فکر و عمل کا کوئی باطل نظام مسلط کیا جاتا ہے تو وہ قدم قدم پر اپنے آپ کو ایک شدید کشمکش سے دوچار پاتا ہے۔ ہمارا نوجوان اس گئی گزری حالت میں بھی اتنا تو ضرور جانتا ہے کہ اسلام نے زندگی کو اخلاقی اقدار پر استوار کیا ہے مگر جب وہ کالج میں داخل ہو کر علم معیشت پر اپنے استاد کی پہلی تقریر سنتا ہے تو اُس وقت اُس کے کان میں یہ بات پڑتی ہے کہ معاشیات کا اخلاق سے قطعاً کوئی تعلق نہیں۔ دولت کمانا اور صرف کرنا زندگی کا ایک الگ شعبہ ہے اور روحانی اور اخلاقی اقدار ایک دوسرے شعبۂ زندگی سے تعلق رکھتی ہیں۔ اسی بنیادی تصور پر اُسے معاشیات کی ساری تعلیم دی جاتی ہے اور جلد وہ وقت آجاتا ہے کہ اسلام سے محبت کے باوجود وہ اسے ایک ناقابلِ عمل چیز یا قصۂ پارینہ سمجھنے پر اپنے آپ کو مجبور پاتا ہے۔

اسی طرح سیاست میں جو نقطۂ نظر اُسے اسلام دیتا ہے وہ اس نقطۂ نظر سے قطعاً مختلف ہے جس سے اسے ان مغربی طرز کے مدارس اور کالجوں میں روشناس کیا جاتا ہے۔ اسلام نے مملکت کے معاملے میں جو تعلیم اُسے دی ہے وہ یہ ہے کہ مملکت ایک انسانی ادارہ ہے جو محض انسانوں کی خدمت کے لیے وجود میں آتا ہے۔ وہ مقصود بالذات نہیں۔ یہ اعتباری اور مجازی طور پر مقتدر ہے اس لیے اس میں الوہیت کی شان پیدا نہیں ہو سکتی۔ امر و اقتدار سوائے خدا کے کسی کو حاصل نہیں جو ازلی و ابدی اور واجب بالذات ہے۔ مگر درسگاہوں میں مملکت کے مسئلے پر اُسے یہ تعلیم ملتی ہے کہ مملکت ہر قسم کی اخلاقی پابندیوں سے آزاد ہے۔ وہ اپنی ذات میں خود ایک خدا ہے اس لیے افراد کا فرض ہے کہ وہ اس کی خاطر اپنے آپ کو بالکل مٹا ڈالیں، وہ اگر جیئیں تو اسی کی چاکری کے لیے اور مریں تو اسی کے آستانہ پر۔

یہی حال فلسفہ، اخلاق، معاشرت، شہریت، تاریخ اور دوسرے علوم کا ہے۔ اسلامی تصورات اور مغربی تصورات میں اتنا بُعد ہے کہ اُن دونوں کو کبھی یکجا نہیں کیا جا سکتا

اس حقیقت کا خود اُس قوم کے اصحابِ فکر تک نے اعتراف کیا ہے جو ہم پر انگریزی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نظامِ تعلیم مسلط کرنے کی شدید آرزومند تھی۔ مسٹر بیلی جو حکومتِ ہند کے امورِ داخلہ کے سکرٹری تھے انھوں نے واشگاف الفاظ میں یہ کہا:

"اس میں قطعاً کوئی تعجب کی بات نہیں کہ مسلمان اس طریقۂ تعلیم سے احتراز کرتے ہیں جو اگرچہ فی نفسہٖ کتنا ہی اچھا کیوں نہ ہو مگر اُن کے ملّی رجحانات کو قطعاً خاطر میں نہیں لاتا۔ درحقیقت اس سے اُن کے ضروری سے ضروری تقاضے بھی پورے نہیں ہوتے یہ طرزِ تعلیم لازماً اُن کے مفاد کے خلاف اور اُن کی ملّی روایات کے منافی ہے۔"

اسی طرح مشہور انگریز ڈبلیو، ڈبلیو، ہنٹر بھی اسی موضوع پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھتا ہے:-

"حقیقت یہ ہے کہ ہمارا طریقۂ تعلیم جس نے ہندوؤں کو اُن کی صدیوں کی نیند سے بیدار کیا اور اُن کے کاہل عوام میں قومیت کے شریفانہ احساسات پیدا کر دیئے ہیں مسلمانوں کی روایات کے بالکل خلاف اور اُن کی ضروریات کے بالکل غیر مطابق ہے بلکہ ان کے مذہب کی تحقیر کرتا ہے۔"

ایک دوسرے مقام پر انگریزی نظامِ تعلیم کے بارے میں مسلمانوں کے معاندانہ طرزِ عمل کی ہنٹر وجہ بھی بیان کرتا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اُس نے اس مسئلہ کا جس صحیح انداز سے تجزیہ کیا ہے وہ بڑا ہی قابلِ قدر ہے اور اپنے اندر غور و فکر کے بے شمار پہلو رکھتا ہے۔ وہ کہتا ہے:

"اکثر انگریزوں کی یہ عادت بن چکی ہے کہ وہ مسلمانوں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ وہ اس بات پر غضبناک ہوتے ہیں کہ مسلمان اس تعلیم کو ٹھکراتے ہیں جسے ہم ایک ایک شخص تک پہنچانے کی ہر ممکن کوشش کر رہے ہیں۔ پھر جس آسانی کے ساتھ ملک کی دیگر اقوام نے اس تعلیم کو اپنانے پر رضامندی کا اظہار کیا ہے اس کو دیکھتے ہوئے مسلمانوں کا انکار انگریز کو اور بھی برافروختہ کر دیتا ہے۔ چونکہ ہندو اس نظامِ تعلیم کے متعلق اپنے دل میں کوئی خلش محسوس نہیں کرتا لہٰذا ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر مسلمان کیوں خواہ مخواہ اپنے لیے تکلیف کا سامان پیدا کر رہے ہیں۔ دراصل ہم نے اس امتیاز کو بالکل

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نظر انداز کر دیا ہے جو بذاتِ خود اتنا ہی پرانا ہے جتنا کہ انسان کا مذہبی رجحان ــــ وہ امتیاز جس نے ہر زمانہ اور ہر قوم میں خدائے واحد کی پرستش کرنے والوں کو مشرکین سے جدا رکھا۔ مشرک اپنی پرستش کے لیے بہت سے معبود رکھتے ہیں اور اس بنا پر ان کے اعتقادات کے بھی کئی ایک حصے ہو جاتے ہیں۔ گبن نے یونانیوں کے متعلق جو آخری فیصلہ کیا تھا وہ اس وقت ہندوؤں پر کہیں زیادہ ٹھیک عائد ہوتا ہے۔ ناقابلِ تقسیم اور باضابطہ اعتقاد کی بجائے جو معتقدین کے اعتقاد پسند دل و دماغ پر کلیتہً حاوی ہو جائے، یونانی علم الاصنام کی بناوٹ ہزارہا قسم کے آزاد اور لچکدار حصّوں کا ایک مجموعہ ہے۔ لہٰذا ان معبودوں کی پرستش کرنے والوں کو بھی اپنے مذہبی اعتقاد کی گہرائی اور درجے مقرر کرنے کی پوری پوری آزادی حاصل ہے۔ لیکن مسلمانوں کے لیے اس قسم کی آزادی ناممکن ہے مذہب اُن سے غیر مشروط، سرگرم اور بے لچک اعتقاد کا خواہاں ہے۔ لہٰذا جو طریقِ تعلیم اُن کے مذہبی اصولوں کو نظر انداز کرے کسی سچے مسلمان کو مطمئن نہیں کر سکتا۔

ہنٹر صاحب نے مسلم اور غیر مسلم کے بنیادی نقطۂ نظر میں جو فرق ہے اُس کی بالکل صحیح نشاندہی کی ہے۔ ایک مسلمان چونکہ زندگی کا ایک خاص نقطۂ نظر اور ایک متعین اسلوبِ حیات رکھتا ہے اس لیے یہ ناممکن ہے کہ وہ مسلمان رہتے ہوئے اپنی انفرادی یا اجتماعی زندگی کے کسی گوشہ میں کوئی ایسی چیز اصولاً گوارا کرے جو اُس کے اساسی تخیل سے متصادم ہو۔ اس کے برعکس ہندو کے نزدیک مذہب چونکہ خالق و مخلوق کے مابین ایک پرائیویٹ رشتہ ہے اس لیے حیاتِ انسانی کے ایک مختصر سے گوشہ کو چھوڑ کر وہ زندگی کے باقی شعبوں میں ہر قسم کے اصول و نظریات قبول کرنے پر بڑی آسانی سے آمادہ ہو سکتا ہے۔ یہی وہ اصل سبب ہے جس کی بنا پر مسلم قوم کے بہی خواہوں نے انگریزی نظامِ تعلیم کی مخالفت کی تھی۔ وہ ترقی کے دشمن نہ تھے۔ انہیں مغربی علوم و فنون سے بھی کوئی پرخاش نہ تھی، انہیں انگریزی زبان سے بھی بحیثیت ایک زبان کے کوئی نفرت نہ تھی۔ وہ اگر مخالف تھے تو اس بات

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے تھے کہ اس نظامِ تعلیم کو جوں کا توں اپنا لیا جائے اور اس قوم کے نوجوانوں کے سامنے تعلیم کا مقصد سوائے روٹی کمانے کے اور کوئی نہ رہے۔ تاریخ کے اوراق شاہد ہیں کہ ان حضرات کے خدشات بالکل صحیح ثابت ہوئے اور سرسید کا یہ خواب کہ "فلسفہ ہمارے دائیں ہاتھ میں ہوگا، نیچرل سائنس بائیں ہاتھ میں اور لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا تاج سر پر" خواب ہی رہا، شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔ علی گڑھ نے نہ تو مذہبی نقطۂ نظر سے کبھی قابلِ رشک شہرت حاصل کی اور نہ وہ عام علمی احیاء ہی کا مرکز بن سکا۔ اس ادارے کے مقاصد خواہ کتنے ہی نیک اور بلند ہوں مگر اس کی عملی افادیت صرف اسی قدر تھی کہ وہ مسلمان نوجوانوں کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں سرکاری ملازمتوں کے لیے تیار کر دے۔ اس کا نتیجہ جو ہونا تھا وہی ہوا۔ اساتذہ اور طلبہ میں مادیت اور ظاہر پرستی پیدا ہو گئی۔ سرسید کا خیال تھا کہ علی گڑھ والے اسلامی ہندوستان کی شاندار روایات کے وارث ہوں گے اور اسلام پر غیر مسلموں نے جو اعتراض کیے ہیں ان کا دندان شکن جواب دیں گے۔ لیکن یہاں عالم یہ تھا کہ

در بغل تیر و کماں، کشتۂ نخچیر شدیم

نظامِ تعلیم کے متعلق کوئی بحث بھی مکمل نہیں ہو سکتی جب تک کہ اس کے ساتھ زبان کا ذکر نہ کیا جائے۔ جس طرح بعض مسلمان مغربی علوم و فنون کے متعلق اس غلط فہمی میں گرفتار ہیں کہ یہ محض حقائق کی پردہ کشائی ہے اور ان سے صرف ذہنی افق ہی وسیع ہوتا ہے۔ اسی طرح زبان کے مسئلہ کو بھی یہ لوگ محض ایک ادبی مسئلہ سمجھتے ہیں۔ جس کا کوئی تعلق کم از کم کوئی خاص تعلق کسی قوم کے مذہب اور تہذیب سے نہیں ہے۔ لیکن یہ بہت بڑا دھوکا ہے جس میں کوئی شخص مبتلا ہو سکتا ہے۔ کسی قوم کی زبان اُس کے افراد کے درمیان محض اظہارِ خیال کا ذریعہ ہی نہیں ہوتی بلکہ یہ وہ زبردست قوت ہے جس سے احساسات و کیفیات کی ساری منتشر طاقتیں شخصیت کی گہرائیوں میں سموئی جاتی ہیں۔ اس سے ہمارے اندر ایک خاص ذہنی میلان پرورش پاتا ہے جو بالآخر ایک خاص طرزِ فکر اور ایک خاص قسم کی سیرت و کردار پر منتہی ہوتا ہے۔ اسی کی وساطت سے ایک قوم اپنے ماضی اور اس کی تاریخی روایات

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سے وابستہ رہتی ہے۔ ان وجوہ کی بنا پر قومیت کو بنانے اور بگاڑنے میں تہذیب کو زندہ رکھنے اور فنا کر دینے میں، قومیت کا مذہب سے تعلق باقی رکھنے اور منقطع کر دینے میں زبان کا اثر غیر معمولی ہوتا ہے۔ جس قوم کے پاس اپنی زبان اور اپنا رسم الخط ہے۔ وہ ایک مستقل قوم ہے اور جو قوم اپنی زبان اور رسم الخط کو بدل دینے پر آمادہ ہو جائے اُس کے متعلق سمجھ لینا چاہیے کہ وہ اپنی موت کے وارنٹ پر دستخط کرنے کی حماقت کر رہی ہے۔ اس سلسلہ میں ہم پنڈت جواہر لال نہرو جیسے وسیع المشرب انسان کی چند تصریحات پیش کرتے ہیں۔

"ایک قوم کی زبان کا مسئلہ ہمیشہ بڑا اہم مسئلہ رہا ہے۔ آج سے تین سو برس پہلے ملٹن نے فلورنس کے ایک دوست کو خط لکھتے ہوئے اس کی اہمیت کا اظہار ان الفاظ میں کیا تھا کسی قوم کے اپنی ایک زبان رکھنے کو، خواہ وہ زبان بگڑی ہو، یا خالص ہو، ایک غیر اہم سا واقعہ نہ سمجھ لینا چاہیے اور نہ اس امر کو کہ اس کے افراد زبان کے برتنے میں صحت کا کہاں تک لحاظ رکھتے ہیں۔ کوئی تاریخی شہادت ایسی نہیں ملتی کہ کوئی سلطنت یا مملکت اس وقت تک اوسط درجے کی خوشحالی و فلاح سے محروم کر دی جا سکتی ہو جس وقت تک کہ اس کے افراد اپنی زبان کو پسند کرتے اور اس کی طرف کافی توجہ کرتے رہے ہوں"

ایک دوسری جگہ پنڈت جی فرماتے ہیں:۔

"رسم الخط اور ادب کا بہت گہرا تعلق ہے اور رسم الخط کی تبدیلی اس زبان کے لیے بہت زیادہ اہمیت رکھتی ہے جس کا ماضی شاندار رہا ہو۔ رسم الخط بدلنے کے ساتھ الفاظ کی شکلیں بدل جاتی ہیں۔ آوازیں بدل جاتی ہیں اور خیالات بدل جاتے ہیں۔ قدیم اور جدید ادب کے درمیان ایک ناقابلِ عبور دیوار حائل ہو جاتی ہے اور قدیم ادب ایک اجنبی زبان کا ادب بن کر رہ جاتا ہے جو مردہ ہو چکی ہو" (میری کہانی جلد اوّل ص ۲۹۵)

(باقی ص ۶۳ پر)

© rasailojaraid.com